سنگ بر آب

اقبال فہیم



سنگ بر آب

اپنے دوست [illegible] صاحب کی خدمت
بغرض [illegible]
اقبال فہیم

۲۶/ ۸۲

اقبال فہیم





مُصنّف :- اقبال فہیم

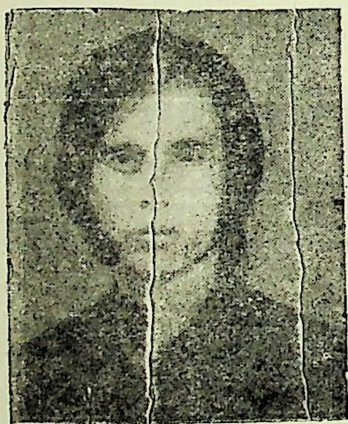
خوش نویس :- معراج ترکوی

قیمت :- ٢٥ روپے

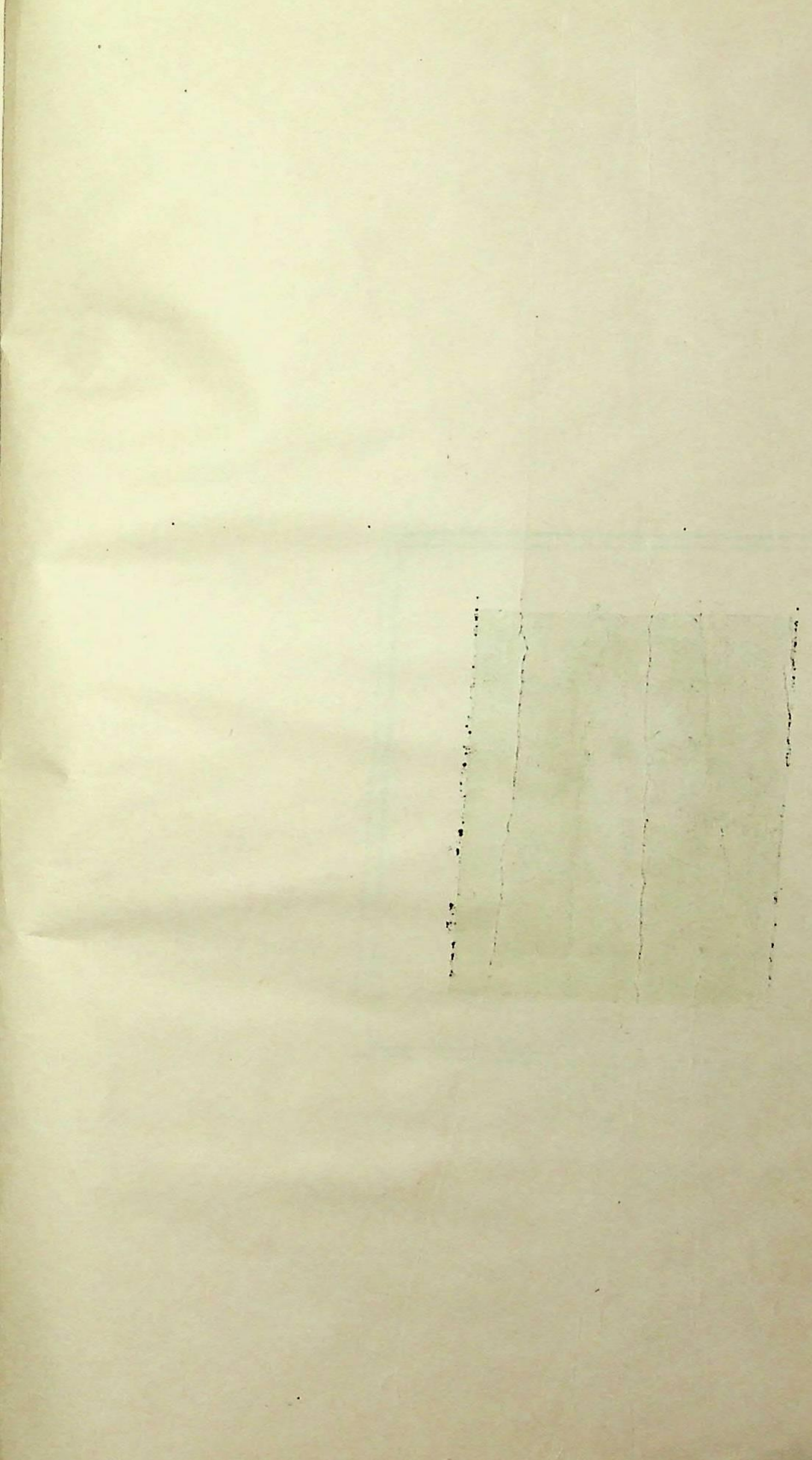
سنہ :- ١٩٨١ء

تعداد :- ایک ہزار





اقبال فہیم



انتساب

اپنی والدہ محترمہ حُسن جان کے نام جنہوں نے
مجھے فن کی نزاکتوں سے روشناس کیا۔

ع
دھوپ کھلتی ہے جب مجھکو لگتا ہے تو جلوہ افروز ہے



اقبال فہیم کی شاعری سوچتے ہوئے ذہن کی شاعری ہے، یہ
سوچ اُن انگنت سوالیہ نشانوں سے پیدا ہوتی ہے جو زندگی نے ایک حساس تخلیق کار
کے لیۓ جگہ جگہ بنا دیۓ ہیں،
اقبال فہیم کا مسئلہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ذات اور کائنات کی
پھیلی ہوئی بیکراں وسعتوں میں سفر کا حوصلہ کرتے ہوۓ اپنے ہی قدموں کی صلابت اور
اُن سے بننے والے نشانوں پر زیادہ بھروسہ کیا، ان کے لیۓ راہوں کے سنگ میل
منزل نما تو ہے لیکن وہ ان کے لیے پڑاؤ کی علامت نہیں بن سکے، وہ بنے بنائے راستوں
سے بھی گزر سکتے تھے، اور اس طرح آبلہ پائی کی آزمائیوں سے بچ سکتے تھے۔ مگر انھوں
نے سفر کو ایک ملنگ سیاح کے انداز میں اپنایا اور نادیدہ زمینوں کے شوق نے انھیں
صحرا، دریا اور سمندر سے اپنا رشتہ جوڑنے کا حوصلہ دیا۔



اقبال فہیم کی شاعری پڑھتے ہوۓ لگتا ہے کہ تخلیقی کرب سے آشنا
ہیں، ان کا حساس سطحی اور ان کا شعری جذبہ اوپر سے گزر جانے والا نہیں، ان کا
تخلیقی کرب ان کے اندر کرید اور جستجو کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ اور اسی لیۓ اپنے

اردگرد سے ان کی نگاہ رتقیاں نہیں پڑتی، اس میں پھول اور کانٹے دونوں ہی کو شاعر کی آنکھ میں بھر لینے کی آرزو ہے، وہ اپنے اظہار میں وضاحت کے بجائے رمزیت کے شیدا ہیں چونکہ فلسفے سے ان کی دلچسپی بہت گہری ہے اس لئے وہ خیال کو لفظ کی محرابوں میں رکھکر چپ ہو جاتے ہیں اور پھر خیال اور لفظ کی آویزش سے ذات کے نہاں خانوں کے روشن ہونے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔



نئی شاعری کی ایک علامت یہ بھی سمجھی گئی ہے کہ وہ کسی مخصوص رویئے کی حامل نہیں اور تشکیک اس کا خاص موضوع ہے، اقبال فہیم کا شعری ذہن تشکیک کی دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر آیا ہے اور اب ان کے یہاں خارج کو پہچان لینے اور کوئی نام دینے کا شعور آگیا ہے۔ اسی لئے انہوں اپنی شاعری کا سفر سوچ اور تجسس کی مشعلیں جلا کر کیا ہے، ابھی انہوں نے صرف راستوں کے پیچ و خم کو پہچانا ہے اور تیز و تند ہواؤں کی زد پہ چراغ لیکر چلنے کی ادا سیکھی ہے۔ لیکن ابھی ان کے عشق عشوہ طراز کو کتنے ہی امتحانوں سے گزرنا ہے، ان کے پاس زندگی بسر کرنے کے لئے بڑی عمر پڑی ہے اس لئے ان سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ مڑکر پیچھے دیکھنے اور تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے سفر کا محاکمہ کرنے

کی عادت ضرور ڈالیں گے کہ اس طرح اپنے گزرے ہوئے لمحوں اور شعری ماضی سے رابطہ تعلق قایم رکھنا بھی ادبی نیکی ہے، اقبال فہیم کی شاعری نیکی اور بدی کے تصادم کو دیکھ کر چپ رہ جانے والی نہیں بلکہ وہ سوچ اور کرب کے دروازوں پر بار بار دستک دینے والی شاعری ہے، نئے آفاق پر کمندیں ڈالنے کی آرزو بھی اقبال فہیم کی شاعری میں جاگتی ہوئی ملتی ہے، ان کی نظموں میں یہ رویہ ان کی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ توانا ہے، ان کی غزل نئی غزل سے اپنا رشتہ کاٹ کر سانس نہیں لیتی لیکن وہ قریب سے دیکھنے پر اپنی ایک الگ پہچان بھی رکھتی ہے۔ کچھ دنوں بعد اقبال فہیم کی غزل کے خدوخال دور سے پہچانے جا سکیں گے۔ اس یقین کی گونج ان کے اس شعر میں بے حد صاف سنائی دیتی ہے۔

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں میرا چہرہ ہے

زبیر رضوی
زُبیر رضوی
۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء، سری نگر

اقبال فہیم ایس، پی، کالج سری نگر میں زیرِ تعلیم تھے جب مارچ ۱۹۶۸ء میں بھدرواہ کالج سے میرا یہاں تبادلہ ہوا، ٹی، ڈی، سی کلاس میں اردو بھی اِن کا ایک مضمون تھا۔

چند دن کے بعد وہ مجھ سے شاگردانہ شفقت کے ساتھ ملے۔ میں نے دیکھا کہ انہیں نہ صرف شعر و ادب سے خاصا شغف ہے بلکہ اس نحیف و نزار اور مختصر سی قد و قامت کے نوجوان میں ایک جوالامکھی جوش مار رہا ہے جس کے لئے تسلی بخش تربیت کی ضرورت ہے۔ کالج میں مجھ سے جس قدر ممکن ہو سکا، ان کی مدد کرتا رہا۔ دوسرے سال کشمیر میں مسلسل چار دن آل انڈیا اردو مشاعرے ہوئے ایک ٹورسٹ سنٹر سری نگر میں، دوسرا اننت ناگ پورہ میں، تیسرا سوپور میں اور چوتھا اچھابل میں، ان مشاعروں میں پروفیسر آل احمد سرور، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، ڈاکٹر قمر رئیس کے علاوہ دیگر بیرونی اور مقامی شعراء نے بھی حصہ لیا، جن میں ایک میں بھی تھا۔

اقبال فہیم کو بھی ان مشاعروں میں شامل ہونے کا موقع ملا اور اپنا وہ ابتدائی کلام سنایا۔ اس میں غالب کے فلسفانہ رنگ کا اثر جھلک رہا تھا لیکن اشعار اور مصرع بندش اور زبان و بیان کے اعتبار سے اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے تھے اور یہ ابتدائی مشقِ سخن میں قدرتی امر تھا۔ آگے چل کر انہوں نے بہت ہی صاف [illegible] لکھنے شروع کئے جو کالج میگزین اور مقامی اور بیرونی رسائل [illegible]

فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ان مشاعروں کے اختتام کے دو ایک دن بعد بڈشاہ ہوٹل امیرا کدل کے سامنے اتفاق سے پروفیسر سرور صاحب سے میری اور اقبال فہیم کی ملاقات ہوئی۔ سرور صاحب نے انہیں پہچان کر فرمایا "لڑکا ہونہار ہے، ان کی تربیت کیجیے۔" اقبال فہیم نے میری طرف روئے سخن کر کے کہا "اب میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اسی سال یعنی ستمبر ۱۹۶۹ء میں میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج اننت ناگ میں ہوا، کچھ مدت کے بعد اقبال فہیم صلاح و مشورہ کے لئے اپنا کلام بھیجتے رہے، لیکن وہ میری ہر بات ماننے کو تیار نہ تھے، میں بھی ان کی ضد سے لطف اندوز ہوتا تھا، آخر تنگ آ کر میں نے اُن کو لکھا کہ خط و کتابت بند کیجیے اور کسی اور سے رجوع کیجیے بات آئی گئی ہو گئی۔

جنوری ۱۹۷۰ء میں مجھے کالج کے طلبہ کے ساتھ کلکتے تک تعلیمی دورے (ایجوکیشن ٹور) پر جانا پڑا، وہاں سے واپسی کے بعد میں کئی دن علیگڈھ میں ٹھہرا، یونیورسٹی کے کئی کشمیری طلبہ سے ملاقات ہوئی جن میں اقبال فہیم بھی تھے، وہ شعبۂ فلسفہ میں ایم۔اے فائنل کے طالب علم تھے، پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ دو ایک دن کے بعد وہ کئی طلبہ کے ساتھ میری قیام گاہ پر آئے اور اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ ہم عنقریب یونیورسٹی میں آپ کے اعزاز میں ایک ادبی جلسہ کرانے والے ہیں لیکن میں اپنی چند مجبوریوں کی وجہ سے انہیں اطلاع دیئے بغیر کشمیر چلا گیا جس پر انہوں

نے انہیں احتجاجاً ایک پُرلطف خط لکھا، مجھے بھی محسوس ہوا، حالانکہ میں نے زیادتی کی ہے۔

غالباً مئی [illegible] میں اقبال فہیم اپنا زیرِ طبع مجموعۂ کلام "سنگ برآب" جو ان کی ایک نظم کا عنوان بھی ہے، پیش لفظ لکھوانے کے لئے میرے پاس لائے۔ کلام دیکھ کر میں ایک تو اس امر پر حیران ہوا کہ یہ بالکل جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ دوسرے اس پر کہ انہوں نے مجھے ہی پیش لفظ لکھنے کے لئے کیوں منتخب کیا جب کہ مجھے جدیدیوں میں نہیں سمجھا جاتا، پھر سوچا کچھ بھی ہو، اقبال فہیم کو مجھ سے حسنِ ظن ہے بلکہ عقیدت۔ لیکن مصروفیات کے باعث آپ کے اصرار اور تقاضوں کے باوجود اب تک کچھ لکھنے نہ پایا، جوں توں کر کے آج فرمائش کو پورا کرنا پڑا۔

اقبال فہیم ذہین و فطین اور اچھا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کسی حد تک انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہ میں مشکل سے کوئی جچتا ہے۔ وہ اپنے استادوں کو بھی تنقید کا ہدف بنانے سے نہیں چوکتے، اب ماشاء اللہ وہ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طالبات مولانا آزاد روڈ سری نگر میں فلسفہ کے لیکچرر بھی ہیں جو غالباً آپ کا حسبِ منشا پیشہ ہے۔

بہرکیف اس مجموعۂ کلام میں آزاد نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، کلام خصوصاً نظموں کو ابہام کی وجہ سے سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے، کچھ محسوس [illegible] معنی شاعر

غزلیں متوازن تاصاف ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی آواز اپنی آواز ہے۔ اور نئی آواز، کلام اکثر ناقابل فہم ہی سہی مگر اپنے منفرد اسلوب و آہنگ کی وجہ سے ایک خاص تاثیر لئے ہوئے ہے۔ فلسفیانہ تشکیک، احساسِ تنہائی، درد و کرب، نامرادی و نارسائی، جنسی نا آسودگی اور بے چہرگی کی خصوصیات اس سے جا بجا مترشح ہوتی ہیں۔

ان کے علامتی الفاظ و تراکیب اس نوع کی ہیں 'ہوا' زرد ہوا' برگِ زوال، لہو، انگلی، آنگن، پیڑ، دھوپ، کالی دھوپ، دریا، آگ کا دریا، پتھر، دشت، سراب وغیرہ۔

اس مجموعہ کی نظمیں، دشتِ امکان، بے زاریاں، سکونِ ذات، عدم سے وجود تک، لمحے کا کرب بے مروت لمحہ، سنگ بر آب، غور و فکر کو دعوت دیتی ہیں اور غزلوں کے یہ اشعار ضرور جاذبِ توجہ ہیں۔

پھر میرے مال و جان کا تم تصفیہ کرو
فی الحال میری لاش کو دریا میں ڈال دو

اک تماشا ہوا پتھر ہوئی آنکھیں ان کی
شہرِ ظلمات میں جو نور اگانے نکلے،

اک سمت سب حصار میں ہیں ذات کے اسیر
اک سمت فکرِ دہر کی تکرار دیکھنا،

زندگی منتشر اوراق کا طوفاں ہے فہیمؔ
ان میں محفوظ کہیں میرا بھی چہرہ ہوگا

اپنی ہی بات تم کو بہت ہی بُری لگے — بیٹھے ہو گر تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

پھر کسی دن ہمیں یہ ڈس لیں گی — ہم لکیروں سے پیار کرتے ہیں

آتشیں جسم میں ڈھلنے والے — رات بھر ساتھ ٹھہرنا ہوگا

خود سے بدظن تو ہو گئی آنکھیں — آگہی مجھ کو کچھ جتا ہی نہ دے

ہر ایک لڑکی لڑکے کے پیچھے اُداس ہے — شب بھر دھکتی آگ جو ٹھٹھری ہوئی لگے

دُھواں سا کس لئے صحرائے غم سے اٹھتا ہے — حیات بُجھتے چراغوں کا سلسلہ سا ہے

کدھر کے وار بچاؤں کدھر کے وار سہوں — میرے چہار طرف رقصِ سنگ ہوتا ہے

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے — میں آئینوں میں رہا ہوں مرا تو چہرہ ہے

تم خود سے کیوں الجھتے ہو مجھ سے کہو فہیم — نیرنگِ زیست کے ہیں جمال و کمال ہا

تمام عمر میں خود کو نہ کر سکا سیراب — ہزار طرح یہ دریا گریز پا نکلا

سمندروں کے سفر انگلیوں پہ گنتا تھا — وہ شخص دشتِ تمنا کا سلسلہ نکلا

مجھی سے مناظر کی قدرت کھلی — دھکتا ہوا میں ہی پانی میں تھا

جوشِ جنوں میں قریہ قریہ صحرا صحرا بکھرے ہیں
سایہ سایہ جاگ اُٹھا ہے کتنے پتھر کھائے ہیں
ساری رات رہی یہ وحشت صبح کا عالم کیا ہوگا
شہر سے اکتا کر میں بھاگا، روز وہاں دن اُگتا تھا

اقبال فہیم بہت سے نوجوان جدیدیت پسندوں کے مقابلے میں غنیمت ہیں،
اُمید ہے کہ مجموعۂ کلام ان کے ہم چشموں میں مقبول ہوگا،

شورؔیدہ کاشمیری
نئی بستی اسلام آباد
۲۱ر مارچ ۱۹۸۱ء

غُبارِ راہ

میں، اپنے لڑکپن میں کشمیر سے ہجرت کر کے پشاور چلا گیا، چونکہ میں نے مکتب میں پڑھ لیا تھا کہ "وہ بھی وقت آئے گا کہ بے ہُنر بھیک تک نہ پائے گا" یہ بات میرے دل و ذہن میں اس طرح سے بیٹھ گئی کہ میں نے مکتب سے فوراً منہ موڑ لیا۔

میرے والد جو کہ بڑے صوفی تھے، اور جنہوں نے کشمیری میں ایک طویل مثنوی بھی کہی ہے، نے بہت سمجھایا کہ علم تمام ہنر کا منبع ہے، اور علم کے بغیر کوئی بھی ہنر ہاتھ نہیں آسکتا۔ آخر کار آپ کے روزانہ اصرار سے تنگ آکر میں نے ہجرت کی اور ہنر سیکھنے کی خاطر خاک چھاننے لگا، جب میں پشاور پُہنچا جہاں کہ میں نے کئی سال بسر کیے۔ مجھ پر علم کی افادیت اور اہمیت کا راز منکشف ہوا، کہ میں نے قرآنی تعلیم کے علاوہ دینوی تعلیم سے بھی خود کو آراستہ کیا، اس طرح سے میں نے عربی، فارسی پر دسترس حاصل کی۔ ہاں انگریزی بھی تھوڑی بہت سیکھ لی۔

اقبال فہیم کی ماں بڑی ذہین اور آزاد طبیعت کی مالکہ تھیں جن کو فارسی، عربی، پنجابی اور پشتو پر بڑا عبور حاصل تھا، پشتو اِن کی مادری زبان تھی۔ ان کی

بدولت ہی اقبال فہمیم فن اور فن کی نزاکتوں سے روشناس ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں اپنے بھتیجوں کی شادی پر میں چند دن گزارنے کی غرض سے آیا تھا، اور جب میں نے واپس جانے کا ارادہ باندھا، تو معلوم ہوا کہ قبائل آگئے ہیں اور انہوں نے تمام تر جانے کے راستے مسدود کر دئیے ہیں، ملک بٹوارے کی نذر ہو چکا تھا، افراتفری، نفسا نفسی اور غیر یقینی کی فضا طاری تھی، زندگی کی تمام تر تلخیاں، رنجشیں اور بے زاریاں ایک جگہ جمع ہو گئیں تھیں، دوریاں میزبانوں کے فرائض ادا کرتی ہیں اور ہم ان کو گود لئے مقدر آزمائی کرتے رہے۔

گھر سے بے گھر ہونے کا احساس جائیداد سے محرومی جلائی وطنی، بے کسی اور بے بسی کے عالم نے تو میری کمر توڑ دی تھی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ میرے بڑے بھائیوں نے میری غیر حاضری میں آبائی جائیداد اپنے درمیان بانٹ لی تھیں اور مجھے اس جائیداد سے محروم رکھا گیا تھا۔

معاشی حالت نے مجھے دبوچ لیا اور میرے ہمدردوں نے مجھے بڑے بھائی کے خلاف عدالت میں کیس دائر کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں بڑے بھائی کے خلاف عدالت میں کھڑا ہو نہیں سکتا ہوں۔

میری شرافت ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی اور ایسا کرنا

آداب و احترام کے خلاف بھی تھا۔ اقبال فہیم کی والدہ محترمہ کو مجھ سے بڑے اختلافات تھے، چونکہ وہ اس طریقۂ کار کو غیر اخلاقی تصور کرتی تھیں۔ ان کے نزدیک حق حاصل کرنا انسانی حق ہے اور حق مانگنے میں پس و پیش کرنا اخلاقی جرم ہے۔

میری سیاسی زندگی بھی ہے۔ میں کئی سال تک کانگریس کا صدر رہا۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے بین الاقوامی لیڈروں کے شانہ بشانہ کام کیا ہے اور تحریکِ آزادی میں میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق کام انجام دیا ہے۔ میں آج بھی قومی یکجہتی کا قایل ہوں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشی ابتری نے میرے حوصلے پسپا کر دیئے تھے کہ ایک دن میرے کئی دوستوں نے شیخ صاحب کو اپنا دکھڑا سنانے کا مشورہ دیا۔ میں شیخ صاحب کی لا اُبالی اور چنچل طبیعت سے واقف تھا، اس لئے میں نے شیخ صاحب کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن دوستوں کے دباؤ سے ایک دن میں شیخ صاحب کے پاس گیا اپنے چند دوستوں کو لئے، اور اپنی روداد سُنائی۔ شیخ صاحب مجھے جانتے تھے۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگے کیا خبر ہے۔ میں نے اپنی کہانی سُنا دی، آپ نے بڑے سلیقے سے کہا، "چاروں طرف جنگ ہے اور ہم جنگ سے بچنا چاہتے ہیں۔ آپ ہی کہئے جنگ سے اپنے کو بچائیں یا لوگوں کو

نوکریاں دے دیں۔

میں بڑا رنجیدہ اپنی حماقت پر پشیمان گھر کی طرف لوٹا۔ اس کے بعد میں کبھی بھی شیخ صاحب سے نہ ملا۔

گوجوارہ سری نگر میں درزی کی دوکان میں کرتا تھا، جہاں کہ ہر مکتب فکر کے لوگ جمع ہوتے تھے اور کشمیر کی اقتصادی، مذہبی اور سیاسی صورت حال پر بڑی لے دے ہوا کرتی تھی اور میں اُن کی گفتگو سے بہت ہی لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

جب مرحوم بخشی غلام محمد برسر اقتدار آئے تو انہوں نے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ چونکہ بخشی غلام محمد کے بنیادی سیاسی نظریے سے مجھے اختلاف تھا اس لئے اُن کے پاس جانا نہ چاہا۔

بخشی غلام محمد نے میری دوکان بند کرا دی، اس طرح سے میری پریشانیوں میں اور اضافہ ہوا۔

جب شیخ صاحب نے رائے شماری کا نعرہ بلند کیا اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ چھوٹی موٹی بستی بسر میں رہنے والی قوم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہے اور اسکی عاقبت اچھی نہیں ہوگی۔ میرا یہ کہنا تھا کہ رائے شماریوں

نے مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیئے اور میری دوکان رائے شماریوں کی وجہ سے
بند رہی۔

میرے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ اقبال فہیم میرے بڑے بیٹے اور
اپنے بہنوں میں سب سے چھوٹے ہیں لیکن اپنی طبیعت اور ذہانت
کے اعتبار سے ان ہی کو سبقت حاصل ہے۔

میرے اور اقبال فہیم کے درمیان اختلافات کے کوہ ہمالیہ کھڑے
ہیں۔ میں اقبال فہیم کو انتہا پسند تصور کرتا ہوں اور یہ انتہا پسندی اِن کو اپنی
ماں کی طرف سے ملی ہے۔ ان کی عمر صحیح طور سے اس دشت سیاہی میں صرف
آٹھ سال کی ہے اور ان آٹھ سالہ ادبی زندگی میں انہوں نے کشمیری زبان و
ادب پر کئی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جن کی پاداش میں ان کو بڑی دل سوز
مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کے نام نہاد دانشوروں سے بُرا بھلا سننا پڑا۔
میرے نزدیک یہ کہنا دُرست نہیں کہ کشمیر نے ابھی تک کوئی بھی صاحب صلاحیت
آدمی پیدا نہیں کیا ہے۔ اور یہاں کے نام نہاد دانشوروں نے اپنی سماجی
تفاوت کو مٹا دینے کے لئے شعر و ادب کا سہارا لیا۔ ہاں یہاں تک تو میں ماننے

رائے شماریوں سے مراد رائے شماری کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔

کے لئے تیار ہوں کہ یہاں کا نام نہاد طبقہ ہے جو کہ غالباً LOWER MIDDLE CLASS
سے تعلق رکھتا ہے نے سماجی برتری کو حاصل کرنے کے لئے فن کا سہارا لیا
ورنہ فن کے لئے پہلے دلِ گداختہ پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے' یہ ناعاقبت اندیش
طبقہ کبھی بخشی غلام محمد کے ہاتھوں تباہ ہوا اور کبھی اِن کا صادق اور ڈی، پی، در نے
استحصال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ادب اور زبان کی خاطر کوئی ٹھوس کام
نہیں کیا۔ یہ لوگ اپنے مستقبل کو بامِ عروج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس رویے
سے ادب اور زبان (خاصکر کشمیری زبان) کو بہت نقصان پہنچا اور کشمیری
زبان نے الہامی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ جیسے کہ یہ زبان اوپر سے نازل ہوئی اور
نازل ہوتے ہی اپنے رتبے کے لحاظ سے پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں داخل
ہوگئی۔ کیونکہ بڑی زبان ہمیشہ بڑی جگہوں پر ہی پڑھائی جاتی ہے۔ اس زبان
کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوگی۔ جب کہ یہ اپنا منصب چھوڑ کر اسکول بچوں
کے ہاتھوں میں آجائے گی' اس سے بڑا صدمہ اس زبان کو اور کیا پہنچ سکتا ہے۔
مجھے اس نظریے سے زبردست اختلاف ہے اور میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں
ہوں کہ یہاں کا دانشور طبقہ مسخرہ ہے"
ہاں یہاں تک کہنا ٹھیک ہے کہ یہ لوگ اردو میں چل نہ سکے اور کشمیری میں

انہوں نے اپنی بقا پائی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اپنی بقا پانے والا ہی دانشور ہوتا ہے۔
اور نہ میں اقبال فہیم کے اس قول سے متفق ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک
کا ادب منافقانہ رویے کا حامل رہا ہے، میں یہ بات پوچھنا چاہوں گا کہ کم از
کم اس دور میں ایمن کامل، غلام رسول سنتوش اور مظفر عازم جیسے شاعر بھی ہیں
کیا اُن پر بھی یہ رائے صادر آسکتی ہے۔

میرے نزدیک بڑی شاعری کی پہچان موضوع ہے اور ہر بڑے شاعر
کے ہاں کوئی نہ کوئی موضوع آپ کو ملے گا اور موضوع کا ہی دوسرا پہلو مسئلہ ہے،
جب تک فنکار کو اپنا موضوع یا مسئلہ معلوم نہ ہو اُس وقت تک وہ تخلیقی کرب
سے آشنا نہیں ہو سکتا ہے، فکر اور مسلسل سوچ سے ہی تخلیقی عمل کی آنچ جاگ
اٹھتی ہے۔ دوسرے معنوں میں تخلیقی عمل کا زینہ سوچ ہے، اور سوچ انسانی
احساسات و جذبات سے وابستہ ہے۔ شاعری ان ہی جذبات و احساسات
کے عرفان کا نام ہے، ادبِ لطیفہ اپنی پہچان خود فراہم کرتا ہے۔ اگر ادب
میں پہچان یا حوالہ موجود نہ ہو تو وہ ادب مجذوبوں کی بڑھ ہو گی۔ دیکھئے بٹوارے
کے المیہ کی شدت پاکستانی ادبار کے ہاں کتنی روشن ہے۔ بٹوارے میں
جو چھرا چلا تھا، ابھی بھی اس چھرے کی شدت و تمازت ختم نہیں ہوئی ہے

اور یہی شدّت موضوع ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کا، محمد عسکری، سلیم احمد اور وزیر آغا کے فن کا۔

ان لوگوں کو ہندوستانی کلچر سے بچھڑنے کا کتنا صدمہ ہے، لفظوں میں بیان نہیں ہوتا۔ اپنے کلچر سے بچھڑنے کا احساس ان کے فن کی شان ہے، شاعری لفظوں کو جوڑ دینے کا نام نہیں بلکہ شاعری فنکارانہ ردِ عمل کے اظہار کا نام ہے۔ میں خوش ہوں اور مجھے فخر بھی کرنا چاہیے کہ اقبال فہیم نے ایک شاعری مزاج قایم کیا ہے۔ اور زبان برتنے کے انداز ان کو آ گئے ہیں اور اس مزاج کی آواز بازگشت ان کے ہم عصروں کی شاعری میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے اقبال فہیم نے "اس میں کوئی مبالغہ والی بات نہیں ہے" اپنے ہمعصروں کو شاعرانہ اداب اور اپنے بزرگوں کو تنقیدی اصولوں سے آگاہ کیا ہے" اور ہمعصر بزرگ ادیبوں نے ان سے تنقیدی باتیں لیں اور نوجوان شعرا نے ان سے فن سیکھا۔ وہ نوجوان جو کہ ان کے پاس آ کر اپنی شاعری سناتے تھے اور فن کی باتیں سیکھتے تھے آج اِن سے بیزار ہیں چونکہ اقبال فہیم وہی بات کہتے ہیں جو کہ ان کی دانست میں صحیح ہوتی ہے۔

اقبال فہیم ایم، اے فلاسفی اور ایم اے اردو میں، لیکن ہیں ڈگریوں

کا قایل نہیں ہوں

اقبال فہیم کی شاعری اپنی آواز ہے، اور انہوں نے کسی کا اثر قبول نہیں کیا ہے۔

بقول ان کے ؎

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں میرا تو چہرہ ہے

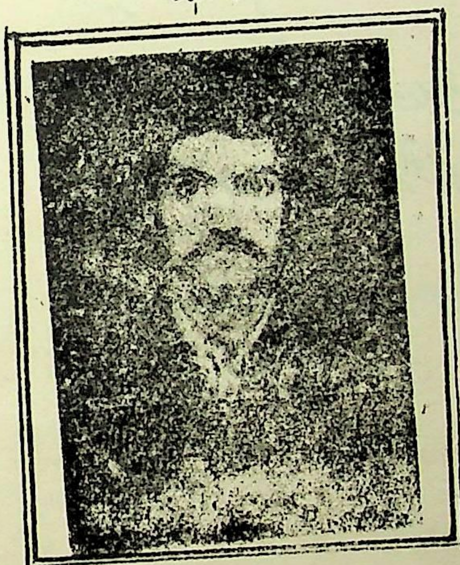
(ماسٹر عبدالعزیز)

اکسپشن جنرلیز نہیں ہو سکتی ہے میں کامل اسٹنوش عازم کو استثنا کے طور پر شاعر مانتا ہوں لیکن میں ان لوگوں کو شاعر یا فنکار نہیں مانتا ہوں جو کہ فن کے بنیادی اصولوں مثلاً وزن، قافیہ، ردیف سے بھی نابلد ہیں۔ لیکن دوسرے شعرا کے شاعری مجموعوں پر تبصرے بھی کرتے ہیں اور لکھتے وقت اپنی ناخواندگی کا احساس نہیں کرتے۔

اپنے قبلہ گاہ محترم ماسٹر عبدُالعزیز صاحب کے نام
جو میرے فن کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

؎
وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں میرا تو چہرہ ہے

خوش نویس

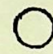


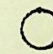
معراج ثمرکوی

نظمیں

 منحنی لکیریں / خالی جیبیں

 عدم سے وجود تک

 لمحے کا کرب

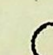
 بے مرُوت لمحہ

 سنگ برآب

 موت جو دہلیز پر ہے

 سکونِ ذات

 ذوقِ تجسُس

 دشتِ امکان

 دہشتِ خاموشی

 پرچھائیاں

 صدا بصحرا

سطحِ دریا پہ مثبت ہے روانی اپنی
موج گھستی ہے سرِ آب فنا ہونے تک
ہم نے مانا ہے یہ درویش کا کہنا لیکن
خاک دھلتی ہے سرِ شام انا ہونے تک

منجمد لکیریں / خالی جبینیں

یہ میں نے سوچا کہ ایک لمحہ پڑا ہے مجھ پر
تمام دریا، تمام جھیلیں، تمام چشمے پڑے ہیں سوکھے
نفس نفس کو شکار کرتی ہیں کالی موجیں
تمام چہرے سکوتِ شب کی ردا لیے ہیں
کہ کالے بادل برس رہے ہیں،
کہ کالی شاخیں سی پھوٹتی ہیں
کہ کالے دریا جو جھاڑیوں میں ہی اُونگھتے ہیں
کہ پابہ صحرا قدم کسی کے بطرف دریا بھٹک رہے ہیں

یہ میں نے پوچھا، ہوائیں گاؤں میں پھر رہی تھیں، کہاں گئیں وہ
یہ میں نے پوچھا، صدائیں شہروں میں گونجتی تھیں، کہاں گئیں وہ
سُنار روشن تھے گاؤں گاؤں، وہ کیا ہوئے ہیں،
بکھر رہی تھی جو روشنی اب وہ کیا ہوئی ہے
وہ لوگ کیا تھے کہ جن کے چہروں پہ تھی بشارت
جبینیں جن کی تھیں روزِ روشن
تھیں جن کی آنکھیں جلال آور

تمام بوٹے، تمام پتے، تمام دریا، جوان کے پاؤں میں ٹپکتے تھے جبینیں اپنی

نہ پوجتے تھے روپہلے تن وہ

وہ پوجتے تھے روپہلے من کو

یہاں تو مجھ پہ پڑا ہے لمحہ

بکھر گیا ہے وجود اپنا

کہ سڑ چکا ہے وجود اپنا

کہ گھس گیا ہے وجود اپنا

یہ لمحہ لمحہ میں رِس رہا ہوں

تمام رِستا ہے ایک جیسا

ہے کرب اپنا

وجود اپنا

یہ میرے چہرے پہ کچھ لکیریں ہیں، منحنی سی،

جبین خالی

خدا نے اپنے رسول واپس بُلا لیے ہیں

قران خاموش طاقچوں کی بنا ہے زینت

نہ جنگلوں میں ہے رقص دریا

ذہن کی گھنٹی سی گونجتی ہے

میں پتھروں پہ رقم کروں گا

یہ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ جو چھاتی ہے روپہلے معنئ قرآن کے سبب

خدائے برحق

خدائے برحق

عدم سے وجود تک

کبھی سوچتا ہوں
کہاں سے میں آیا
کہاں جا رہا ہوں
میرے پیش و پس اک دھندلکا سا کیا ہے
میں اپنے عدم کا تو پرتو نہیں ہوں
میں "میں" ہوں
میں "ہم" ہوں
کبھی "تم" بنوں گا
کبھی "وہ" رہوں گا

اسی دشتِ امکاں میں آواز دینا
یہاں نیم شب کو
سسکتا ہے کوئی
بھٹکتا ہے کوئی
مچلتا ہے کوئی

کہ آنسو لہو کے بہاتا ہے کوئی
یہاں بارشِ سنگ ہوتی رہے گی
کسی کے لبوں سے نکل کر وہ بکھرا
کہ اندھی خلا میں ابھی تک صدا ہے
ہے معدومیت کا تقاضا یہی کیا
کہ ہر باغ اُجڑے
کہ ہر شاخ کٹ جائے اپنے شجر سے
کہ ہر پیڑ سوکھے
اسی کشمکش میں شب و روز میں نے
تراشے ہیں پیکر
کہ ان میں سے کوئی تو باقی رہے گا۔

لمحے کا کرب

کبھی سوچتا ہوں
کہ ریگِ رواں پر میں اپنے لہو سے یہ تحریر کر دوں
انا الحق کا حامل
نبوت کا حامل
جو اپنی جلن میں جھلس تو رہا ہے
کہ صحرائے ادراک سے اٹھ رہا ہے
دھواں ہی دھواں سا
کبھی سوچتا ہوں
دھوپ کی لکیروں میں تحلیل ہو کر میں بادل کی صورت مکانوں کی چھت پر
کبھی برف بن کر بچھو لیٹا رہوں گا
کبھی سوچتا ہوں
کہ ریگِ رواں سے میں منہ ہاتھ دھو کر
میں ریگِ رواں اوڑھ کر
کوہ و صحرا میں آوارہ پھرتا رہوں گا
کبھی سوچتا ہوں
شہادت کی انگلی کو توڑ دوں

کہ آنکھ اپنی پھوڑ دوں
نگاہ اپنی سوئے بیاباں کر دوں
کبھی سوچتا ہوں
اُس انسان کا تذکرہ میں کروں گا
جو دشتِ فنا میں
سمٹتا رہا ہے
بکھرتا رہا ہے
پگھلتا رہا ہے
کہ آنسو لہو کے بہاتا رہا ہے
کبھی سوچتا ہوں
کئی سال سے ایک چڑیا دریچے پر میرے کسی بات کا تذکرہ کر رہی ہے
یہ کچھ کہہ رہی ہے
کہ دشتِ فنا میں بکھر کر میں تو مُدّت سے اِن کے جلتی رہوں گی
کبھی سوچتا ہوں
انا الحق کا حامل
ہُو اللہ کا حامل

حقیقت بن کے پرتو حقیقت میں اظہار کر دے
مجھے پھر بکھیرے وہ دشتِ فنا میں

بے مُروت لمحہ

میں، یہ سوچتا ہوں
کہ تم نے کہا تھا
ہمارے نگر کی پہاڑی پہ چڑھ کر
ہمارے نگر کا نظارہ بھی کرنا
اُفق تا اُفق پھیلتا سا لہو
اور پس منظری میں، یہ گدھ اور کوّے جو رنگِ فضا پر
جھپٹ تو رہے ہیں
پلٹ تو رہے ہیں
لہو گرم رکھنے کا اک اور بہانا سبھی کر رہے ہیں
یہاں بس دُھواں ہے
دُھواں ہی دُھواں ہے
دُھویں کی گھٹن ہے
گھٹن زندگی ہے
گھٹن بندگی ہے
گھٹن نغمگی ہے

میں یہ سوچتا ہوں
کہ تم پہ ہی ہو جائے تکمیلِ وحشت
میں پھر موسموں کے سبھی رنگ دیکھوں، بکھیروں
میں رنگوں کی مالائیں پہناؤں تم کو
چرندے، پرندے، اڑیں پھر فضا اور ہوائیں
میں، یہ سوچتا ہوں
کہ تم نے کہا تھا
یہاں لوگ مرتے نہیں ہیں
یہاں لوگ جیتے نہیں ہیں
یہ یخ بستہ ادراک کے لوگ ہیں
ہر طرف لوگ ہیں
لوگ ہی لوگ ہیں
سارے باشندے اس شہر کے
اپنے چہروں سے مانوس بھی تو نہیں
صرف مجبور و معذور ہیں
یخ زدہ لوگ ہیں۔

میری آنکھ میں اُنگلیاں ٹھونس دو
میں نظارہ کروں گا نہیں اس نگر
کا۔

سنگ پارے

ایک لمحے کے تصور میں کئی لمحے اُگے
اور رقصاں ہو گیا دشتِ صدا
میں نے تجھ کو دیکھنا چاہا تھا بس
آئینۂ احساس میں
لمحۂ احساس میں
تو مفید مگر نہیں لمحات کا
انکشافِ ذات میں لمحات کا سایا نہیں
میں، فقط یہ دیکھنا چاہوں ور
لمحات کی ہی دھوپ میں
لمحات کی ہی آگ میں
ایک لمحے کے تصور میں کئی لمحات ہیں
لمحۂ احساس میں یا ہے
لمس لمحہ
دھوپ لمحہ
سر پھرے صحراؤں میں اک سر پھری آندھی چلے
سر پھرے دشتِ صدا میں موجِ خوں اُٹھنے تو دے

اور ہم یہ دیکھ لیں لمحات میں

میرے خدا!

تو کہاں ہے

کیوں یہ دریچہ نہیں کھلتا ہے اب

اے خدا

میرے خدا

موت، جو دہلیز پر ہے

(ماں کی موت پر)

زردیاں، کوہ و صحرا، گھنی جھاڑیاں
سوچتے سوچتے، کو بہ کو، میں پھرا
پا بہ دریا رہا
میں نے سمجھا کہ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہیں، سرسبز شاداب ہونے
کے روشن نشان
دُھوپ کھلتی ہے جب مُجھکو لگتا ہے تو جلوہ افروز ہے،
بادلوں کے گرجنے سے لگتا ہے مجھکو تو آوارہ سی روشنی
کوہ و صحرا بیاباں بیابان بجھنے لگے
ناگہاں، جسم و جاں میں اترتی ہے اک مضطرب سی ہوا
اور پھر
پیڑ پودوں پہ پت جھڑ مسلط ہوئے
دشتِ دریا بہے
نیم خوابیدہ سا ہے، کبھی رنگتی وحشتیں، پیلی نیلی صدائیں مکانوں میں خالی بدن
ڈھونڈنے پھر رہی ہیں، کہ خالی بڑھوں پر کفن ڈالنے جا رہی ہیں۔
بین کرتی ہوئی اونگتی روشنی جو بہ سوئے خموشی بھٹکتی چلی ہے

•

کہ میں، ہلکے پاؤں تعاقب میں اس کے
مناظر کئی راستے میں بچھا کر، شعلہ افشاں سی آنکھیں لئے جو چٹانوں کے پیچھے
کئی معجزے دیکھتا ہوں
سر بہ زانو صدائیں، بال بکھری نوائیں، پتھروں میں لہو بو رہی ہیں
کہ جاں سے الگ کوئی ہستی نہیں
جسم چھوٹے، بطرف بیاباں ہوتی صدا
جسم کی قربتیں روح افزا تو ہیں
دشتِ مقسوم میں ہے، یہ آوارگی
اپنی اپنی صداقت ہے، آوارگی
تم گئے، روشنی چھن گئی، دھوپ شہروں سے روپوش ہے
دھند پیڑوں میں رہنے لگی
چاند، سورج تو اندھے ہوئے

سکونِ ذات

اے ہوا،
اے سکوتِ سمندر کی موجِ ہوا،
ہیں ترے بطن میں،
زلزلے اور آتش فشاں
میرے مقسوم میں ہے یہ ریگِ رواں
اے ہوا،
اے سکوتِ سمندر کی موجِ ہوا
میں تعاقب میں تیرے
بیاباں بیاباں پھرا
پا بہ صحرا رہا
اے ہوا
اے سکوتِ سمندر کی موجِ ہوا
تو کہاں
اے ہوا
اے سکوتِ سمندر کی موجِ ہوا

ذوقِ تجسّس

میں نے سوچا'
مرے ہاتھ پاؤں میں کیلیں اگر ٹھونک دے پھر کوئی
میں نے سوچا
وہ دریا گزرتا ہے جو شہر کے بیچ سے
اس کا منبع کہاں
اس کا مدفن کہاں
اس کے ساحل پہ میں نے بھی سوچا بہت
اس کی لہریں گنیں
پیچ و بل بھی گنے
میں نے سوچا
کہ اس کی روانی میں ہے مضطرب سی ہوا
اور اس کے اُجڑنے کی ہے داستاں
کوہ و صحرا ، بیاباں بیاباں
میں نے سوچا
کہ اس میں ذرا کود لوں

میں بھی دیکھوں کہ میری حقیقت ہے کیا
جسم و جاں کی صداقت ہے کیا

دشتِ امکاں

دھوپ آنگن میں، میرے اتر آئی تھی
کور آنکھوں میں کچھ انگلیاں ٹھونس کر
پوچھتا تھا ہر اک سے خدا کون ہے
کس نے چاہی پرستش، عبادت مری
لامکاں لا الا کی حقیقت ہے کیا
کب خدا ہو گیا
آدمی کب ہوا
طاقِ ادراک کے اے صحیفے بتا
کالے حرفوں کے رنگین معنی بتا
پھر وہ سورج اتر کر مجھے پی گیا
میں ہوں ادراک کا اب دھواں ہی دھواں

دشتِ خاموشی!

ایک تتلی اُڑ گئی
ایک بتی بجھی
رینگتی اُنگلیاں بر سرِ دار تھیں
سرد جنگل گناہوں کی پاداش میں
پائے زنجیر تھے
لمس لمحات تھے
آنکھ شعلوں میں ملبوس تھی
اس تمنا میں ہم
سر پہ آتش فشاں
جنگلوں کی صدا لاد کر
کوہ و صحرا میں آوارہ پھرتے رہے
سطحِ دریا پہ لکھ دے کوئی پھر مقدس کتابوں کی آیات کچھ
جن میں ہو قصہ فرعون و نمرود کا۔

۵۱

پرچھائیاں

اے ظفر![1]

موت میری اسی دن ہوئی

تم نے جب رنگ بے زاریاں، اپنے چہرے پہ اوڑھیں

تم تو اُس روز نہ ماضی کی چادر لیے

ان کی ٹیبل پہ ٹوٹی ہوئی سسکیوں میں بٹے تھے

مجھے تم نے دیکھا نہیں

موت، آنکھوں پہ میری کھڑی تھی،

[1] میرے دوست ایم۔ اے ظفر

صدا به صحرا

آؤ

وہیں اُس پیڑ کے نیچے دریاؤں کی بات کریں

زرد ہوائیں، پیلے دریا، گاؤں میں رہتے بستے تھے

دھوپ کے پیکر، رنگ رواں جب کھیتوں میں رقصاں تھی

برف کے موسم میں پیڑوں سے دھوپ چھنا جب کرتی تھی

آنگن آنگن، دھوپ پہنگر، بادل بادل روتے تھے،

تب اک بچہ

مجھ سے پوچھا کرتا تھا

میری اماں

گڑیاں دے کر مجھ کو کیوں

بہلاتی تھی

سانحہ

بڑا مطمئن تھا سمندر کا پانی

ہواؤں کی لہریں

کہ پھر ایک بچہ لیے ہاتھ میں ایک پتھر

سمندر کی جانب بڑھا

اپنے کاندھوں پہ پتھر اٹھائے، سمندر کی موجیں کئی روز محشر

بپا حادثے میں رہیں

شہر گاؤں، سمندر کا سینہ رفو کرنے آئے

بہت دیر تک بچے کی ناداں حرکت پہ نالاں رہے

مجھ کو احساس ہے، جیسے پانی دھنکتا ہوا

میرے پیچھے چلا

آرہا ہے۔

ہم جنس

پھر یہ بلی اس بلّے کو اپنے گھر لے آئی ہے

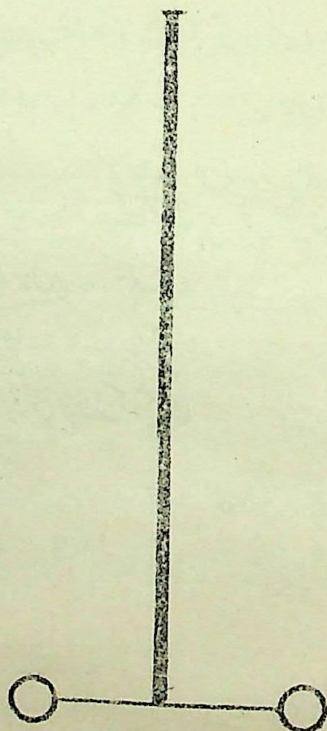
کل کی بات ہے

اس بلّے نے اس کے پلّے کھڑکی باہر پھینک دیئے تھے

یہ بلی اس روز بھی چیخی بلکتی روئی

اور چلائی!

غزلیں



ہم بھی اپنا خیال رکھتے ہیں
جی پہ اُن کا ملال رکھتے ہیں
گو تعلق ہوا ہے بے معنی
یوں تعلق بحال رکھتے ہیں

آنکھوں میں حرارت ہے، دُکھتا ہوا منظر ہے

میں کہاں سے کہاں آیا، دھکا ہوا گھر ہے

گاؤں میں پھرے وحشت، شہروں میں ہے سناٹا

پیدل تو چلے آئے، جانے کوئی اندر ہے

بجھتے ہوئے خوابوں کا جُھلسا ہوا دریا ہے

اس شخص سے ڈرتا ہوں، جو راہ میں پتھر ہے

نادیدہ سی بتی ہے، لٹکے ہوئے چہرے ہیں

کچھ پیلی فضاؤں میں رنگیلا سا خنجر ہے

پھر پیار نہیں کرنا، تم خاک بسر ہو گے

سبز پیلی چٹانوں میں دریا کا سا منظر ہے

٭

جنگل جنگل دھکے کوئی جلتی دھوپ سجائے ہیں
پتے بوٹے، رینگتے لمحے، آگ فروشاں آئے ہیں

آنکھیں اُس کی شعلہ فشاں ہیں، ویرانوں کو ڈستا ہے
کیا جانے ہے کون جسے زنجیر پہنا کر لائے ہیں

آنگن کے پتوں سے چھینو اُن کی زرد صدائیں بھی
خاموشی پھر چیخ نہ اُٹھے، کتنے دھوکے کھائے ہیں

جوشِ جنوں میں قریہ قریہ، صحرا صحرا بکھرے ہیں
سایہ سایہ جاگ اُٹھا ہے کتنے پتھر کھائے ہیں

انگاروں سے جھولی بھر لو اور آجاؤ شہروں میں
شعلہ شعلہ آنکھیں چمکیں، سانپ کئی لہرائے ہیں

آؤ دیکھیں سچ ہے کتنا، کہتے ہیں اقبال فہیم
دامن میں سورج کو ٹانکے، اُفق اُفق پھرتے ہیں

آگ فروشاں ... یہ ترکیب میں نے اختراع کی ہے

صحرا صحرا بکھرا تھا، یا ساری رات میں جاگا تھا
کمرے کی دیواروں تم نے کیا، یہ سب کچھ دیکھا تھا

ساری رات رہی یہ وحشت، صبح کا عالم کیا ہوگا
شہر سے اکتا کر میں بھاگا، روز وہاں دل اکتا تھا

آؤ، اس لمحے کو ڈھونڈیں، جس کے در پے دریا تھا
شہر کے بہتے ہنگاموں میں، شاید لمحہ ڈوبا تھا

پتا پتا، بوٹا بوٹا، ڈرتا ہے وہ روند نہ دے
رات گئے، ایک اندھا پیکر، دھوپ پہن کر آیا تھا

آؤ، بانٹیں جھلسا پانی، کھال ہماری اتری ہے
دریا دریا سب جھلسے ہیں رات گئے وہ رویا تھا

سرد ہوا ہے، زرد ہے چھاؤں، آگ بجھی ہے گاؤں میں
ریگِ رواں کو چاٹ گئی ہے، دھوپ جو بہتی صحراؤں میں
آنچ ہتھیلی سے اُٹھتی ہے، دریا دریا منتظر ہے
جنگل جنگل ہونکتی وحشت، کہتی ہے آ جاؤں میں
من کی موج سے چھپتا پھرا ہوں، ہڈی پسلی غائب ہے
جانے اُس دیوار کے پیچھے، لیٹا کون ہے چھاؤں میں
آبلہ پا اب میں ہی رہا ہوں، رستہ رستہ سورج ہے
آنگن آنگن پھول کھلے ہیں، رنگوں کے دریاؤں میں
سایہ سایہ سب بکھرے ہیں، پتھر برسے شہروں میں
آئینہ ریزوں میں بٹا ہے، کون سا منہ نہلاؤں میں

دھوپ بچھی تھی آنگن آنگن ناچ بھی تھا صحراؤں کا
سارے لوگ برہنہ سر تھے اک منظر تھا گاؤں کا
انگاروں کی فصلیں تھیں، کھیتی شعلوں کی اٹھتی تھی
رات رہے ہم کتنے چیخے، شور کہاں دریاؤں کا
بارش کے موسم میں جنگل، ڈھلوانوں سے پھیل گئے
پانی پانی سب لہریں تھیں، اور منظر تھا چھاؤں کا
اپنے جنوں میں ہم نے سب کچھ جنگل جنگل چھوڑ دیا
صحرا صحرا پابہ صدا ہے، بنجر روپ ہواؤں کا
آنکھیں اپنی موند چکے ہیں، دریا دریا بہتے ہیں
ایک سمندر سب چھلسے ہیں، منظر ایک الاؤں کا

پیڑ، کئی رنگیلے ہوتے
کیا بادل کچھ گیلے ہوتے
آنکھ میں اپنی سورج ہوتا
ہاتھ رسیلے پیلے ہوتے
دھوپ بچھے یا دریا جاگے
آنگن کچھ سبزیلے ہوتے
آنچ ہتیلی پر جمتی ہے
دریا دریا میلے ہوتے

دریا دریا آگ بہے گی، کیا کہنا
سحرا صحرا خاک اڑے گی، کیا کہنا

ایک سی بات ہے من ڈولے یا تن ڈولے
پتھروں میں پھر ریگ اُگے گی، کیا کہنا

شہروں میں آوارہ پھریں جو ہم ہونگے
من کی کون زخم جلیئے گی، کیا کہنا

دشت و صحرا بھی نا گفتہ تھے ہمیں، ہم کبھی صورتِ نفس بازار تھے
آنکھ جھلسی ہوئی، خواب ٹوٹے ہوئے، ہم کبھی منظروں میں بھی جھنکار تھے
شہر گاؤں کے کتنے پریشان تھے، آسماں سے بلائیں اترتی رہیں
ایک برہنہ بدن، رقصِ اظہار تھا، سنگ سجدوں میں اپنے گرفتار تھے
شہر گاؤں کبھی گونجتے غار تھے، یا زمیں یا آسماں آگ ہی آگ تھے
آدمی پابہ زنجیرِ حسرت میں تھے، اور پرندے کئی مبر سردار تھے
ناشنیدہ صدا ہم سے منسوب تھی، ہم صداؤں کی نادیدہ تصویر تھے
نیلی جھیلوں میں کس نے ڈبویا ہمیں، ہم ابھی ناشناسائے اظہار تھے
موجِ دریا، آئینہ ہم سے تہی، دیدہ دشت و صحرا ہیں ہم اجنبی
ہم سماتے کہاں ہم میں طوفاں ہزاروں سمندر کے بیدار تھے
اس تعاقب میں کیا گزری ہے عمرِ جنوں، ڈھونڈھتے ہیں کسی کی نظر کا فسوں
کون تھا وہ جو پس منظروں میں رہا، ہم ہی دیوار و در میں گرفتہ رہے

دھوپ آنکھوں میں تھی زردیاں اوڑھ کر، ہم برہنہ صدا گاؤں گاؤں پھرے
کتنے چشمے اُگے، کتنے صحرا بہے سرد لہروں نے پاؤں جہاں پر دھرے
دشت و صحرا مری انگلیاں سو گئیں، شب گزاری میں لفظوں کی شمعیں جلیں
ابر آلودہ اب بھی ہیں پلکیں مری، کتنے شعلے تھے، کتنے تارے گرے
کوہ و صحرا ہمارے تعاقب میں تھے، دھوپ ہی دھوپ تھی، ہم پا بہ صحرا رہے
زرد چھاؤں میں [illegible] جاتے کہاں، لرزہ اندام پتے کہاں ہم پھرے
وہ تو آئے گا مجھ کو یقیں ہو گیا، کتنے سنسان سڑکوں کے پہرے لگے
جال [illegible] ہو گئی جنگلوں کی صدا، پیڑ شہروں میں تھے مر گئے ہیں، ارے
پھر گھروں سے گئے، پتھروں سے گئے، کتنی تنہائیاں ہم سفر ہو گئیں
شہر گاؤں سبھی سب اجنبی ہو گئے، کھنڈروں کی صدا اوڑھ کر ہم پھرے

بستی بستی لُٹی ہے جو اپنی نگر، آنچ اُٹھتی رہی سنگ و اشجار کیا

کھیت پکتے رہے حسرتوں کے یہاں، میں بجوکے ابھی بر سرِ دار کیا

آج تک میں نے اُسکو نہ دیکھا کہیں، آج تک لوگ ہیں پا بجولاں ہیں

زرد شعلوں میں ملبوس پھرتا رہا، وہ برہنہ بدن نیلی رفتار کیا

رہگزاروں کو تنہائیاں کھا گئیں، جس میں جنگلوں کی صدائیں پلیں

اُن پہاڑوں کے پیچھے گھٹائیں چھپیں، دیکھنا وہ ابھی محوِ گفتار کیا

لے چلیں ہم سمندر سمندر راہیں، ہم سبھی دیکھ لیں سب کا عالم ہے ایک

رنگینی چونٹیاں مانگتی ہیں دعا، دھوپ، بادل، یہ بارش ہے آزار کیا

ایسی ویسی غزل میں نے کہہ دی مگر، سات رنگوں کے اس میں مقید اثر

ایک لہجے کی غزلیں ہیں کہنا نہیں، لگ رہے ہیں مجھے لوگ بیزار کیا

اب تخیل تفکر ملے گا کہاں، سونی سونی پڑی ہے یہ فن کی دوکان

اپنی دنیا کہاں [illegible] اپنے جذبے کہاں، سارے احساس ہی جیسے بیکار ہیں

بے صدا، بے نوا، گزر جائیں
پا بہ صحرا رہیں، کہ مر جائیں
خامشی ناگنی ہے چہروں کو
آتشیں زخم اپنے بھر جائیں
خونچکاں، اُنگلیاں کہاں ہوں گی
زردیاں کام اپنا کر جائیں
شہر بنجر ہیں اور تم بیزار
آؤ، اقبال آج گھر جائیں

رات بھر میں کتاب پڑھتا ہوں
اور دن بھر، یہ میں سسکتا ہوں
انگلیاں، مشعلیں سی جلتی ھیں
ایک قصہ جو یاد کرتا ہوں
رہگزاروں میں سو گئے دریا
اندھے سورج سے میں بھی ڈرتا ہوں
کیسی آندھی، کہاں کا طوفان ہے
زرد چھاؤں میں روز سوتا ہوں
اپنے کھیتوں میں آگ بوتے تھے
ان کسانوں کو یاد کرتا ہوں
میں نے سوچا فہیم کیا جانے
دریا دریا، میں آگ روتا ہوں

؎ پہلا شعر کیسا لگا

وہ کبھی مجھ پہ وار کرتے ہیں

اور کبھی انتظار کرتے ہیں

پھر کئی ہاتھ، آگے بڑھتے ہیں

پھر مجھے بے قرار کرتے ہیں

پھر کئی ہاتھ پاؤں بوتے ہیں

پھر وہی انتظار کرتے ہیں

صبح محشر کو سونگھنے والے

آگہی نار تار کرتے ہیں

پھر کسی دن ہمیں یہ ڈس لینگی

ہم لکیروں سے پیار کرتے ہیں

کوئی میرا کہیں پتا ہی نہ دے
میرا ہونا مجھے سزا ہی نہ دے

سر پھرا قافلہ ہواؤں کا
مجھ کو صحراؤں میں صدا ہی نہ دے

آئینے میں وہ کس کو ڈھونڈے گا
آگ بھڑکے گی تو ہوا ہی نہ دے

خود سے بدظن تو ہو گئی آنکھیں
آگہی کچھ مجھے جتا ہی نہ دے

دستِ گل میں ہوا پریشاں ہے
نمِ شبنم اُسے کچھ بتا ہی نہ دے

ہم کہ مبہوت نظر
اور تم برق و شرر
تم بہاروں کا سراب
ہم کہ پت جھڑ کا اثر
ہم سے ناموسِ وفا
تم سے ہے حسنِ نظر
ہم نے چاہا ہے تمہیں
تم نے دیکھا تھا اِدھر
اپنی تسکین کے لئے
زندگی ہوگی بسر
تم تو روئے تھے فہیم
دھول اٹھی تھی مگر!

ڈوبد سورج کہ ٹھہرنا ہوگا
آگ، دریا میں بپھرنا ہوگا

یا تو شاخوں پہ چہکنا ہوگا
ورنہ پیڑوں سے اُترنا ہوگا

آتشیں جسم میں، ڈھلنے والے
رات بھر ساتھ ٹھہرنا ہوگا

تپتے ہونٹوں سے مہک آتی ہے
موج در موج بکھرنا ہوگا

خواب آنکھوں میں، جھلستے دریا
رہگزاروں سے گزرنا ہوگا

مضمحل ہونے کا خدشہ ذات پر اکثر کھلا
کرب کا دریا اُگا، آئینہ پیکر کھلا

بے جہت لفظوں کی شورش دشتِ تنہائی میں تھی
نغمۂ بے چہرگی کا ان دنوں منظر کھلا

موسموں کا سانحہ تھا، کنکروں میں آگ تھا
برف زِ بارش سہہ چکا زرہ جو صدا تھر کھلا

اک مغنّی پتھروں میں دشتِ عریاں ہو گیا
رنگ و لب کے ناچ کا یہ ڈوبتا منظر کھلا

نقش تھے جتنے صداقت کے وہ جل کر رہ گئے
اک اُبلتا آگ کا دریا مرے اندر کھلا

موجِ خوں سر سے گزرنے کے کئی خدشات تھے
منظروں میں رینگتا تھا آگ کا مصدر کھلا

وہ بھی آسیبِ تمنّا ہی کا سایا ہوگا
جس کے پیکر کو خلاؤں نے اُبھارا ہوگا

غلطی ہم سے ہوئی یہ کہ حقیقت مانگی
تو حقیقت میں اُجالے کا اندھیرا ہوگا

زندگی ایک سرکتے ہوئے سائے کے سوا
خونِ احساس سے ٹپکا ہوا قطرہ ہوگا

میں وہ آئینہ ہوں جو بکھرا ہے ذرہ ذرہ
اُنہیں ذروں میں بیاباں بھی سمٹا ہوگا

آتی ہیں میرے تعاقب میں صدائیں کیسی
رات کے دشت سے تم نے ہی پکارا ہوگا

زندگی منتشر اوراق کا طوفان ہے فہیم
ان میں محفوظ کہیں میرا بھی چہرہ ہوگا

برف بر دوش سمندر کو بجھانے نکلے
قہر انگیز ہواؤں کو دکھانے نکلے

اک تماشا ہوا، پتھر ہوئی آنکھیں ان کی
قعرِ ظلمات میں جو نور اُگانے نکلے

رات ہی رات، ہواؤں نے دبوچا اُن کو
پیلی سر سبز گھپائیں جو ہٹانے نکلے

ایک مجمعے میں مداری نے کہا یہ فخر اً
ہم شررِ ذات پہاڑوں کو نچانے نکلے

ضبطِ تحریر سے لب بستہ شعائیں پھوٹیں
کیا عجب لوگ تھے، دریا کو سکھانے نکلے

پیڑ پودوں کی کٹائی میں لگیں گے کچھ دن
ہم کہ بے صوت و صدا شہر بسانے نکلے

وہ میرے من میں سمندر بجھا کے نکلا تھا
سنگتی ریت بدن میں اُگا کے نکلا تھا

جو ریگ ریگ بکھروں تو صدائیں دوں کس کو
وہ کالی دھوپ میں مشعل جلا کے نکلا تھا

نہ آتما ہی بھٹکتی، نہ سوکھتی آنکھیں
اِدھر اُدھر سے پرندے اُڑا کے نکلا تھا

میں کیا کروں کہ خموشی نے ڈس لیا ہم کو
میں کیا کروں کہ وہ شعلہ جگا کے نکلا تھا

برس رہی تھیں گھٹائیں وہ شاخ شاخ اُگا
جو جسم و جاں کی صدائیں اُٹھا کے نکلا تھا

میں انتظارِ لہو[1] میں نہ اوڑھ لوں وحشت
دلیلِ لذتِ فردا بتا کے نکلا تھا

[1] "انتظارِ لہو" ترکیب میں نے اختراع کی ہے۔ اگرچہ شاعری گرائمر کے لحاظ سے ترکیب مناسب نہیں

٭٭

اُداس قلب کی تحریرِ خامشی پڑھ لیں
ہم اپنے مرثیۂ قتلِ خود سری پڑھ لیں

لگے گا وقت کہ لمحات زرد ہو کے گریں
لکھی ہے خامۂ خوں نے یہ اک صدی پڑھ لیں

ہتھیلیوں سے اُگیں گے پھر آگ کے دریا
حروفِ شب کے ستاروں کی ابتری پڑھ لیں

جمے ہیں برف مکانوں میں جو مقید ہیں
یہ دھوپ دھوپ فضاؤں کو سرسری پڑھ لیں

غزل سنا دی کہ ہو گئے دانا وحید اختر[1]
پھر آگ آگ سمندر کی بے بسی پڑھ لیں

[1] وحید اختر کو میں ستم رسیدہ لوب سمجھتا ہوں۔

دھواں سا کس لیے شہرِ غم سے اٹھتا ہے
حیات بجھتے چراغوں کا سلسلہ سا ہے

کدھر کے وار بچاؤں کدھر کے وار سہوں
مرے چہار طرف رقصِ سنگ ہوتا ہے

یہ کس کے سنگِ ستم سے لہولہان ہوا
کہ زخم زخم مرے آنگنوں کا سایا ہے

ہتھیلیوں پہ نہ رقصاں تھی روشنی اپنی
دلیلِ ذات غبارِ صدائے صحرا ہے

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگ گئے
میں آئینوں میں رہا ہوں مرا تو چہرہ ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے میں دل کھول کر رویا نہ تھا
پا بہ زنجیرِ جہاں اٹھا تھا، نقشِ پا سویا نہ تھا

ہم برہنہ پا، سرابوں کے تعاقب میں گئے
زرد چھاؤں میں تہہِ دریا کوئی رویا نہ تھا

انگلیوں سے آگ پھوٹی، آنکھ سے چشمے بہے
پتھروں کے رقص میں، تم نے تو کچھ کھویا نہ تھا

کرب آلودہ میں لمحے، پھونک لے روحِ نجات
ہم قریب ان کے گئے جو بے صدا صحرا نہ تھا

پھر ہمیں منظور اپنی نوحہ خوانی ہے فہیم
اُجڑے لمحوں کا لہو آنگن میں کب بویا نہ تھا

آنکھ کھلتی ہی نہ تھی، اور کوئی منظر کھلتا
لمحہ بھر تھا، میرے احساس کا پیکر کھلتا

تہہِ دریا سے نمایاں تھی تباہی اپنی
اتنے لمحوں کا لہو اپنے ہی اندر کھلتا

پھر بتا دے یہ صداقت لیے جائیں گے کہاں
پیلی لہروں میں تھا ملبوس، سمندر کھلتا

تمام عمر میں خود کو نہ کر سکا سیراب
ہزار طرح یہ دریا گریز پا نکلا

سمندروں کے سفر انگلیوں پہ گنتا تھا
وہ شخص دشتِ تمنا کا سلسلہ نکلا

ہوا ہے جذب، بدن کا لہو کہ ہم نے تو
بہت سنبھال کے رکھا تھا، نارسا نکلا

کھلی تھی آنکھ کہ وا جسم و جاں کے منظر تھے
صدا کے دوش پہ ہر ایک نقشِ پا نکلا

مری آنکھ، تو بھی فگار ہے
ابھی انتظارِ بہار ہے

مری آنکھ، جل گئی روشنی
یہ جمالِ گردِ غبار ہے

وہی زندگی کی کسک بھی ہے
وہی زندگی کا قرار ہے

میں کہاں کہ خود سے نہ مل سکا
تو کہاں، جو گردِ غبار ہے

ابھی رو رہی ہے کلی کلی
ابھی برگِ گل کا حصار ہے

مجھ کو بھیجا گیا، شہروں کی نوائیں لکھنے
اپنے مجذوب خداؤں کی ادائیں لکھنے

ناگہاں برق گری اور نہ ناگہاں شور اٹھا
ہم چلے تھے، کئی لوگوں کو سزائیں لکھنے

دھوپ شہروں میں لٹے اور الم ناک سے منظر ابھریں
کوئی پھرتا رہا، در در پہ دعائیں لکھنے

سوچ قدموں کی کسی سمت لگے پھر جانا
سینۂ طور پہ آوارہ صدائیں لکھنے

پھر غضب ہوگا شب و روز رہے گی بارش
لوگ نکلیں گے جو گھر گھر سے وفائیں لکھنے

ہر لمحہ اپنی ذات کو بیدار دیکھنا
اس پیکرِ خیالی کو خوں بار دیکھنا
پھر سطحِ آب پر جو مگ آئیگی حرف حرف
تحریرِ خامشی کی وہ گفتار دیکھنا
ہر نقشِ ہست و بود کا پتوں پہ کھینچنا
موجِ نفس کو دیدۂ اظہار دیکھنا
فصلیں ہیں مست و بود کی منظر سراب کا
رقصِ خودی بھی ہو نہ عدم زار دیکھنا
اک سمت سب حصار میں ہیں ذات اسیر
اک سمت فکرِ دہر کی تکرار دیکھنا
گھوڑوں کی دوڑ سے ہے فضاؤں کا سینہ چاک
لوٹ آئی ہو نہ گرمئ پیکار دیکھنا
اقبال بن کے پیکرِ آواز آئے گا
اُبھرے شب کی چیخ سرِ دار دیکھنا

انگلی کٹی تو سارے بدن کا لہو بہا
گلدان کا گلاب بھی تو مستعار تھا

کس کس کے بارے میں کہوں کن کی مثال دوں
میری طرح یہ پیڑ بھی کتنا اجڑ گیا

دریا کو کیا ہوا کہ مرے در پہ جم گیا
کل سرپھری ہوا نے، کبوتر اڑا دیا

فرصت کہاں کہ تم سے کوئی گفتگو کرے
اک شخص چیختا ہوا دیوار و در میں تھا

پتھر کی موج بن کے لہو سے جُدا رہے
یہ دشتِ بے غبار سلگتا ہوا رہے

پتوں کی زرد چھاؤں میں تنہا میں سوچ لوں
چہروں پہ خامشی کا سمندر کھلا رہا

ہے سوچ سوچ سایۂ امکاں سے پرے
اچھا ہے ساتھ شعلۂ صوت و صدا رہے

لمبی سی انگلیاں مری آنکھوں میں ٹھونس دو
اک شخص میرے ساتھ سراپا وفا رہے

میں اُس کے ساتھ کیسے رہوں مطمئن نعیم
جو شاخِ پُر بہار شجر کی ادا رہے

اس دشتِ بے ضرر کی تو آب و ہوا نہ ڈھونڈ
میں پیکرِ خیال ہوں میری صدا نہ ڈھونڈ

خود سوکھ جائے گا مرے اندر کا پیڑ بھی
منظر لہو لہان ہیں، زورِ ہوا نہ ڈھونڈ

کیا رنگ لائے گا وہ سبھی محوِ ہوش ہیں
اس شہرِ آفتاب میں دشتِ عصا نہ ڈھونڈ

خود آگہی کے قتل میں مرنا پڑا ہے مجھے
چہرے بتا رہے ہیں کہ زورِ ادا نہ ڈھونڈ

اُگتے ہی منظروں کو یہ کیا ہو گیا نسیم
میں صاحبِ کتاب ہوں رقصِ انا نہ ڈھونڈ

ع۱
اندر وہ بے خبر ہے کہ باہر ہوا ہے کیا
اس دشتِ قیل و قال میں ظاہر ہوا ہے کیا

کھلنے کی آس میں سبھی آتش بدوش ہیں
اس شہرِ بے نوا کو یہ آخر ہوا ہے کیا

بہلا سکا نہ عالمِ افسردگی کوئی
ہم رقصِ آرزو کا وہ شاعر ہوا ہے کیا

اک بات رقصِ آگہی کیوں منکشف ہوئی
اس رنگ و بو کے ناچ میں ظاہر ہوا ہے کیا

آنکھیں خموش اور ہیں سب قہقہے اداس
اقبال رقصِ جاں میں دائر ہوا ہے کیا

۱؎ آپ اس کو مطلع کیوں سمجھیں!

ریگِ رواں کی گرد میں مجھکو گھنگاں دے
نیرنگِ روشنی کا سمندر اچھال دے

وہ دشتِ دل وہی کی عرق ریز دھوپ ہے
اسکو میں چھو سکوں مجھے اتنا کمال دے

ہر ایک اپنے جسم میں پیاسرد ی سے جل گیا
صوتِ وصدا کو وادیٔ غم سے نکال دے

آجاؤں جنگلوں میں اگیں پیڑ بولنے
مردانہ پتھروں سے مجھے تو جلال دے

آئینہ مانگتا ہے فریبِ نظر فہیم
شب بھر کی وحشتوں سے مجھے تو نکال دے

وہ شہر خامشی میں بھی بکھری ہوئی لگے
تپتے بدن کو برف بھی جھلسی ہوئی لگے

تصویر اپنی خود کو بہت ہی بُری لگے
اک چیخ کائنات کی سمٹی ہوئی لگے

برفیلے ہاتھ، اس کا تعاقب نہ کر سکے
میرے قریب آئی تو بکھری ہوئی لگے

اپنا خیال قربت جاناں میں بھول جائیں
اے کاش! کائنات بھی نکھری ہوئی لگے

ہر ایک لڑکی لڑکے کے پیچھے اُداس ہے
شب بھر دھکتی آگ جو ٹھٹھری ہوئی لگے

جی چاہتا ہے تم کو رکھوں اپنے روبرو
جی چاہتا ہے تم سے میں پوچھوں سوال ہا

تم ہو کہ ہے ابھی بھی یہ صحرائے دل لگی
بے سایہ پیڑ ورنہ جیا ہوں میں سالہا

پتے بدوش، زردیاں لیکر کہاں چلیں
اُجڑے سمندروں سے ہوئے ہیں وصال ہا

تم خود سے کیوں اُلجھتے ہو مجھ سے کہو فہیم
نیرنگِ زیست کے ہیں جمال و کمال ہا

فی الحال، میری روح کو تن سے نکال دو
فی الحال، بے کسی کا سمندر اچھال دو
فی الحال، مجھکو رہنے دو کچھ بدحواس سا
فی الحال، کوئی جسم نہ کوئی خیال دو
فی الحال، پتھروں پہ رقم ہو سکوتِ شب
فی الحال، انتشار کو دوزخ میں ڈال دو
فی الحال، موج موج کسی کے قدم ہوئے
فی الحال، ذات، خوف، تردد کو ٹال دو
فی الحال، شب گزیدہ نگر کا نوا لکھیں
فی الحال، منظروں کا دھکنا سنبھال دو
فی الحال، پیڑ پیڑ سے اٹھنے لگے دھواں
فی الحال، مہر و ماہ کو الٹا زوال دو
پھر میرے مال و جاں کا تم تصفیہ کرو
فی الحال، میری لاش کو دریا میں ڈال دو

سیراب کر رہا ہے کہستاں کہاں فہیم
اٹھتے قدم بطرفِ بیاباں کہاں فہیم

زندہ ہوں موسموں کی حقیقت جبھی کھلی
پھر دیکھنے ہے وحشتِ زنداں کہاں فہیم

میں ہوں بقول ان کے اک اجڑی سی آرزو
رکھتے ہیں اپنے پاس پریشاں کہاں فہیم

سب کچھ فنا ہوا میری آنکھوں کے سامنے
حاصل ہوا ہے دیدۂ حیراں کہاں فہیم

میری سنو تو بیٹھو، چراغاں کئے ہوئے
تجدیدِ آرزوئے گریباں کئے ہوئے

پھر وضعِ شوق، ضبطِ تمنا کو دیکھیے
ہر ولولہ ہو چاک گریباں کئے ہوئے

اپنی ہی بات تم کو بہت ہی بری لگے
بیٹھے ہو گر تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مدت ہوئی وہ تم سے بچھڑ کے چلا گیا
عرصہ ہوا ہے طرفِ بیاباں کئے ہوئے

مانا ہے ہم نے وضعِ تغافل مگر ہنوز
آئینہ صد ہلال ہے مژگاں کئے ہوئے

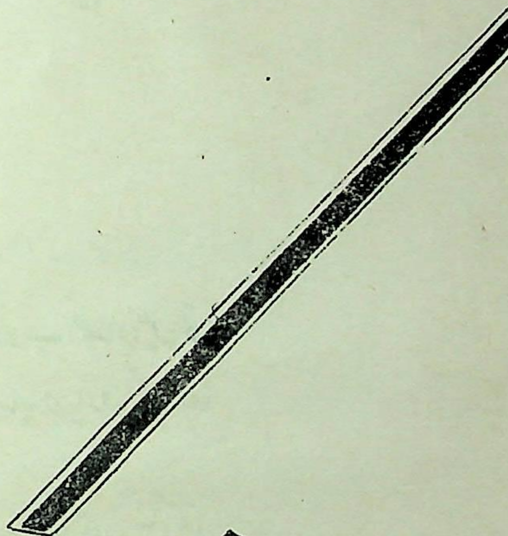
تردد تو بے اطمینانی میں تھا[1]
سڑھا سایہ دریا روانی میں تھا

مجھی سے مناظر کی قدرت کھُلی
دھکتا ہوا ایسے ہی پانی میں تھا

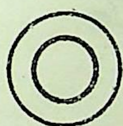
صدا بند چہرے کی بے نماریاں
میں اُجڑا سا لمحہ کہانی میں تھا

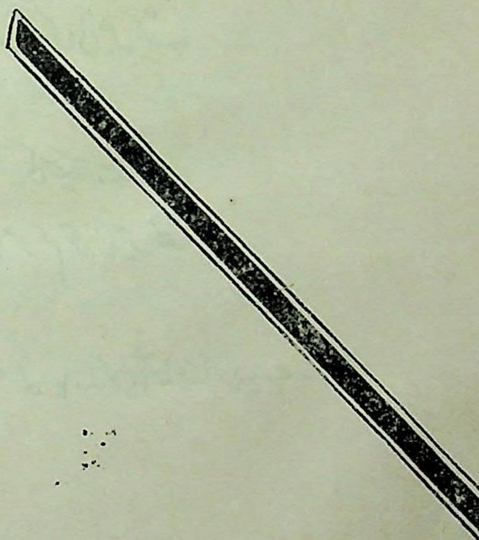
زرا بعد، اُس کی حقیقت کھُلی
کہ رنگیلا موسم جوانی میں تھا

[1] پائے کو میں نے حذف کر دیا ہے۔



ضمیمہ





دل نہیں وحشت و بیاباں ہوں گے
تیرے مسکن کئی ویراں ہوں گے

ہم سے ملکر وہ بھی حیراں ہوں گے
پھر پریشاں و پشیماں ہوں گے

ہم پہ رہ جائیں گے کتنی کو یوں کہ
وہ تو آئینۂ حیراں ہوں گے

آؤ باتوں میں الجھنے والے
خود سے کیوں دست و گریباں ہوں گے

کھلتا ہے میرے سامنے زنداں کبھی کبھی
ہوتی ہے ان کی زلف پریشاں کبھی کبھی

ایسے جنوں کا یہ خلش ہائے درد سا ہم نہ کر قبول
جس سے ہو چاک دل کا گریباں کبھی کبھی

آئینہ دیکھا اگر اپنی بھی لغزشیں
ہو کیوں نہ آدمی بھی پشیماں کبھی کبھی

روزِ حساب اور نہ شرمندگی بڑھے
اپنے کئے پہ روتا ہے انساں کبھی کبھی

پردے کے پیچھے اور بھی پنہاں ہیں جو
[illegible] تیرے ارماں بھی کبھی کبھی

دردِ منت کشِ زباں نہ ہوا
خوں آنکھوں سے کب رواں نہ ہوا
تو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا
اور پردوں میں تو نہاں نہ ہوا
خامشی تھی نہ اپنی بے معنی
قصۂ غم اگر بیاں نہ ہوا
تجھ سے ملکر کبھی یہ تھا مقصود؟
شہرہ اپنا کہاں کہاں نہ ہوا
تھا جنوں میں فہیم اک حکمت
ترے انداز پہ گماں نہ ہوا

میرے لہو میں ابھی اضطراب باقی ہے
یہی کہ مجھ میں ابھی آب و تاب باقی ہے

یہ کائنات، یہ دل کی کتاب باقی ہے
جدا جدا ہے حقیقت سراب باقی ہے

حقیقتوں کا نہ دے مجھ کو واسطہ کوئی
فریبِ شمس و قمر میں، عذاب باقی ہے

ہماری ذات، تنقید ہے مشغلہ اپنا
کریدتے ہو تو اک سراب باقی ہے

فہیم خود سے ملو، ہاں کبھی کبھی تو ملو
تلاش میں ہے زمانہ نقاب باقی ہے

گفتنی

میں مسرت الٰہی اندرابی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں
نے اس کتاب کا پروف دیکھا، ساتھ ہی میں پرنسپل محترمہ
شملہ مفتی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کئے بغیر رہ نہیں سکتا
ہوں کہ انہوں نے میرے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو باندھا اور اپنے
زریں مشوروں سے بھی نوازا۔ میں اپنے عالم و فاضل دوست
جناب شوریدہ کاشمیری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں
نے میری کتاب کو بڑی ہمدردی اور جان فشانی سے دیکھا۔
اور فن کے کئی رموز سے آشنا کیا۔ میں اپنے ہم عمر دوستوں نور نسیم
اور ہم عرج ظفر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے زندگی
کو سمجھنے میں میری خاطر خواہ دستگیری کی۔ نور نسیم کو میں
بے چین روح کی آواز مانتا ہوں۔
محمد یوسف محبوب کا اگر شکریہ نہ کیا جائے تو یہ بڑی

ناانصافی ہوگی۔ میں محبوب سے متاثر ہوں اور انہوں نے زندگی جینے کے انداز مجھے سکھائے اور میں ان کو ناول نگار اور مضمون نگار اپنے ہمعصروں میں شمار کرتا ہوں۔

میں اپنے دوست معراج ترکوی (جن کو کتابت کے میدان میں انعامات سے نوازا گیا ہے) کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی ہی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ کتاب برسرِعام آئی ورنہ میں کہاں اور یہ کتاب کہاں۔

اقبال فہیم

